ڈاکٹر بلال سہیل
ایسوسی ایٹ پروفیسر
فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج راول پنڈی

اُردو میں ترقی پسند تحریک: سماجی پس منظر اور معنوی مباحث

In this research paper, the advent of progressivism in Urdu literature has been analyzed with reference to its sociopolitical milieu. The impacts of Ali Garh Movement and Allama Iqbal are also discussed. The famous collection of short stories, "Angarey", which marked a turning point in the history of progressive Urdu literature, has been critically considered. The role of Marxism, commitment, form, content and motifs have been studied to understand the significance of this multidimensional movement.

پہلی عالمی جنگ کے بعد برّ عظیم کو کساد بازاری سمیت کئی طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ مغرب سے آنے والے نئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی تصوّرات نے ہندوستان کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو متاثر کر رہے تھے۔ آزادی، سماجی اور معاشی انصاف کے حصول، ظالمانہ رسوم اور فرسودہ اخلاقی بندھنوں سے معاشرے کو آزاد کرانے اور عام لوگوں کو نئے شعورِ حیات سے ادب کے ذریعے آگاہ کرنے کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ادب میں خیالی دنیا کی جگہ حقیقی دنیااورواقعیت نگاری کے تصوّرات سامنے آرہے تھے۔اُردوادب کی تاریخ میں ترقی پسندادب کی تحریک اپنے دیر پا اور ہمہ گیراثرات کی وجہ سے اہم ترین تحریک کہلانے کے لائق ہے۔ اِس تناظر میں اُن حالات، تصورات اور محرکات کا جائزہ لیاجانا ضروری ہے۔ جنھوں نے ترقی پسند ادب کو جنم دیا اورناول جیسی اہم صنف بھی اُس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کے تنظیمی اور فکری ڈھانچے کا تعلق ہے۔ اُس کے بارے میں اب تک کئی تصانیف، مقالات اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر کی ''روشنائی'' سے لے کر علی سردار جعفری، عزیز احمد، ڈاکٹر قمر رئیس کی ہم عنوان کتب '' ترقی پسند ادب'' تک اور وہا ں سے ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی اور ممتاز حسین، احتشام حسین، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، باقر مہدی اور اصغر علی انجینئر جیسے ترقی پسند ناقدین کی تصانیف کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ دوسری طرف اِس تحریک کے مخالفین کی تحریروں کا اپنا ایک دائر ہ ہے ۔اِس مقالے میں ترقی پسند تحریک کے پس منظر، آغاز اور اثرات کے حوالے سے ایک ایسا انتقادی طریقہء کار اختیار کیا جار ہا ہے، جس سے اُس فکر کی وضاحت ہوسکے، جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ اہلِ ادب کے پیشِ نظر تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جس انسان دوست اور روشن خیال فکر نے ترقی پسند تحریک اور تنظیم کی شکل اختیار کی، وہ کسی ہنگامی یا اتفاقی صورت ِ حال کا نتیجہ نہیں تھا۔ اُس کے پس منظر میں اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی میں سیاسی، معاشی اور ادبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ تاریخی اعتبار سے ترقی پسند تحریک کا تعلق ۱۸۵۷ء کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف دہلی اور بعض دیگر مقامات پر آزادی کے لیے کی جانے والی کوششوں سے بھی بنتا ہے، جس میں ناکامی پر برّ عظیم پر انگریزوں کے مکمل قبضے کی راہ ہموار ہوئی، جس کی وجہ سے محکوم ہندوستانی معاشرے میں حاکم قوتوں کے افکار سے متاثر ہونے کا عمل شروع ہوا۔ معاشرتی اقدار

بدلنے لگیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں کے مکمل قبضے سے پہلے بھی مقامی معاشرہ بعض سنگین مسائل سے دوچار تھا۔ اِس لیے اُس کا کسی بھی نئی فکر سے متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں تھا۔ترقی پسند نقاد، دانش ور اور شاعر محمد صفدر میر نے اُس دور کے ہندوستانی معاشرے کا اِسی تناظر میں تجزیہ کیا ہے:

''اُنیسویں صدی سے پہلے کا معاشرہ ہماری عام زبانوں اور کلاسیکی اور روایتی ادب کا پس منظر ہے۔ اُس معاشرے کے عناصر میں سب سے زیادہ اہمیت اُس خودکفیل ، محدود، غیر متغیّر، معاشی سیاسی نظام کو ہے ، جسے فیوڈل یا جاگیرداری نظام کا نام دیا جاتا ہے ۔اُس معاشی، سیاسی نظام کی نبیادوں پر اُستوار ماحول اپنے مخصوص ارادے رکھتا ہے اور اُن سے ہم آہنگ فکری، اخلاقی ، مذہبی عقاید، اقدار اور مسلمات کا مربوط شیرازہ منسلک ہے ۔ یہ ہی عقائد، اقدار، مسلمات اُس دور کی ذہنی فضا کو متعین کرتے ہیں اور معاشرے کے ہر فرد اور گروہ کے طرزِ عمل کی کسوٹی کا کام دیتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک مکمل اور محکم فکری کائنات ہے او راس کائنات کے رہنے والوں کے لیے باہر نہ کوئی کائنات ہے نہ ہو سکتی ہے۔اِس تو ہم پرست ، یک رنگ ، قنوطی ، تقدیر پر شاکر عملی تجربات سے عاری عقل دشمن، جاگیردارانہ معاشرے کی زندگی کی طرح ادب بھی بڑی حد تک جمود کا شکار تھا۔ چند مُستثنیات کے سوا ادب کا بھاری بھر کم ذخیرہ حقیقی زندگی، اُس کے مسائل اور موضوعات سے عاری تھا۔ وہ ادب خواص کی کنیز تو کہا جا سکتا تھا عوامی مسائل اور فکر کا عکاس نہیں۔ اُس ادب کی زبان ، کردار اور موضوعات بھی اعلیٰ طبقے کے محتاج تھے اور خود ادیب بھی ۔''[۱]

برِّعظیم کا ہزاروں میل دُور سے آنے والی قوم کی تجارتی کمپنی کا غلام بننا تو ایک بہت بڑا المیہ تھا ہی ،اُس کے ساتھ کچھ اور حقائق غور بھی طلب ہیں، جیسے، اُس زمانے کا ادب،جس میں اُس زوال پذیر معاشرتی نظام کی مناسب عکاسی نہیں کی گئی،بل کہ ایسا لگتا ہے جیسے اُس دور کے ادیبوں کو اپنے ماحول میں ہونے والی کسی بڑی تبدیلی کا پوری طرح احساس ہی نہیں تھا۔ اُن کے لیے اپنے شیرازہ بند نظامِ حیات و کائنات کے قائم و دائم رہنے کے بارے میں تشکیک وتحریف کا مرحلہ ابھی بہت دُور تھا، اُن کی ذہنی فضا میں ویسا ہی ٹھہراؤ اور یک رخا پن نظر آتا ہے، جو ازمنہء وسطیٰ کے عروج کے زمانے میں اُن کے پیش رو فارسی شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ اگر کہیں سماجی الجھنوں کی شکایت کی بھی گئی تو اپنے روایتی ،فکری اور معاشرتی ماحول سے بلند ہوئے بغیر کی گئی، غالباً کوئی نیا سماجی سانچا اُن کی نظر میں نہیں تھا۔ اُس دور کے ادبی معیار کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند نقاد اور ناول نگار عزیز احمد کہتے ہیں:

''بے شک کوئی تحریر جس کے معنی بھی ہوں زندگی اور حقیقت سے خالی نہیں ہوسکتی، لیکن بہت سی تحریروں میں بہت سی تصنیفوں میں یہاں تک کہ کسی ملک کی صدیوں کی شاعری یا ادب میں زندگی اور حقیقت کا اظہار ،خصوصیت سے طبعی زندگی اور حقیقت کا اظہار تشنہ اور نامکمل رہ سکتا ہے، چناں چہ غدر سے پہلے تک کی شاعری میں حقیقت تو یقیناً ہر جگہ پر شعر اور شاید ہر لفظ میں موجود ہے لیکن حقیقت کے بہت سے پہلو بہت سے پرتو ایسے ہیں ، جو موجود نہیں۔''[۲]

یوں برِّعظیم اپنے اردگرد کے بہت سے مسائل سے بے گانہ یا بے خبر تھا، جب انگریز ایک بہت بڑی اور نئی قوت کے طور پر سامنے آئے، جن سے یہاں سیاسی اور تہذیبی سطح پر طرح طرح کے مسائل پیدا ہوئے مگر اُن کی ایجادات اور سائنسی شعور نے برِّعظیم کے معاشرے میں تبدیلی کا عمل ضرور تیز کیا۔ دن بدن بدلتی ہوئی صورتِ حال اور نئی تعلیم نے یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا کر

دیا۔ جو روایتی انداز فِکر سے کسی قدر مختلف انداز میں سوچنے لگا تھا۔ ادب کو حقیقی زندگی کے قریب لانے کی کوششیں سر اُٹھانے لگیں۔ برّ عظیم کے روایتی معاشرے کے روایتی ادب میں تبدیلی کا جو تصوّر فورٹ ولیم کالج کے سام راجی ایجنڈے اور مرزا غالب کی انفرادی عبقریت تک محدود تھا علی گڑھ کے مصنفین نے اپنی ترجیحات کے مطابق اُسے ایک حد تک اجتماعی صورت دی۔ ادب میں اجتماعیت، عقلیت، مادیت، مقصدیت اور اصلیت کا ذکر آنا شروع ہوا۔ جس سے ادب اور سماج کے رشتوں کا شعور پیدا ہوا۔ ادیب کے کردار اور اُس کے اثرات کے متعلق سوچا گیا۔ مغربی اثرات کے زیرِ سایہ پھیلنے پھولنے والی علی گڑھ تحریک کی بعض مثبت جہات کا برّ عظیم میں ترقی پسند فکر کے ارتقا میں ایک کردار رہا ہے۔ ادب میں افادیت، اجتماعیت کے ساتھ عقلیت کا تصوّر سامنے آیا۔ علی گڑھ تحریک نے ادب میں تنقید کی اہمیت واضح کی اور تنقید کی ایک مربوط روایت شروع کی۔ تاہم علی گڑھ تحریک کے محرکات مقامی، مذہبی اور طبقاتی مفادات تک محدود تھے، اِس کے برعکس ترقی پسند تحریک کے محرکات بین الاقوامی، غیر مذہبی، سیاسی اور طبقاتی آلودگی سے ماورا تھے۔ اُردو ادب میں ترقی پسند فکر کے اہم پرچارک علی سردار جعفری نے علی گڑھ تحریک کو مادی تناظر میں سراہا ہے:

> ''حالی اور شبلی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے پہلی بار ادب اور تنقید کی بنیاد مادی حالات پر رکھی۔ اُنھوں نے بتایا کہ ادیب مادی حالات کے مطابق اپنا چولا بدلتا ہے۔ مواد اور ہیئت دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شبلی نے تو تشبیہوں اور استعاروں کی تبدیلی کے بھی مادی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی، (شعر العجم، جلد چہارم) اِس اعتبار سے حالی کا ''مقدمہء شعر و شاعری'' اور شبلی کی ''شعر العجم۔ جلد چہارم'' بہت بڑے کارنامے ہیں اور ابھی تک اُردو تنقید کی کوئی کتاب اُن سے آگے بڑھنا، تو درکنار اُن کے قریب بھی نہیں آسکی۔''[۳]

آگے چل کر مقصدی ادب کے حوالے سے علی گڑھ تحریک کے اثرات اکبر الہ آبادی کے یہاں ایک مختلف تناظر فراہم کرتے ہیں۔ مقصدی ادب کی یہ جہت علامہ اقبال کی صورت میں ایک بھرپور، آفاقی اور مفکرانہ نمونے کے طور پر شہرت، مقبولیت اور استناد کی انتہا کو پہنچی۔ اقبال ادب برائے زندگی کا جو ایک توانا، مربوط اور مؤثر تصوّر دیتے ہیں، اُردو میں ترقی پسند تحریک کے لیے اُس سے بلواسطہ طور پر ایک عمدہ بنیاد بہم ہوئی۔ اُردو میں اقبال نے ہی پہلی مرتبہ ادیب کے کردار کی عملی وضاحت کی۔ اقبال نے اُردو ادب کو پہلی بار عالمی ادب، عالمی فلسفے اور عالمی سیاست سے متعارف کروایا تھا۔ اقبال نے ثابت کیا کہ ادیب محض ادیب نہیں ہوتا، بل کہ وہ معاشرے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو میں نئے ادب یا ترقی پسند ادب کی تحریک رومانوی ادب کے خلاف ایک اصولی احتجاج بھی تھا۔ جس میں علامہ اقبال کے باغیانہ کلام اور فکری نظام نے بھی ایک محرّک کا کام کیا۔ اقبال اگرچہ ایک زمانے میں انگریزی رومانوی شاعروں سے متاثر رہے ہیں، مگر اُن کے کلام کا غالب حصّہ اور اُن کی فکر رومانویت اور ادب برائے ادب کے تصوّر سے متصادم ہے۔ آزادی کی تحریک، سام راج سے نفرت اور قومی بیداری کی مہم میں اقبال کی رجزیہ شاعری اور قومی زندگی میں فن کی اہمیت سے متعلق اقبال کے خیالات نے بھی اُس ماحول کی تیاری میں قابلِ لحاظ کردار ادا کیا، جو ترقی پسند تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ ہندوستان کی غلامی، انگریزی سام راج، سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریاں، مارکس اور اینگلز کی اِس نظام پر تنقید اور ان کے افکار کی بناء پر ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب، جو انسانی تاریخ میں اِس حوالے سے منفرد تھا کہ ایک دیرینہ شہنشاہی نظام کو عام آدمیوں نے ناکام بنایا تھا، جو مظلوموں اور محنت کشوں کی جدوجہد کی ایک غیر معمولی کام یابی تھی۔ جس نے اقبال ایسے حرکت دوست فن کار کو متاثر کیا۔ ''اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو''، ''کب ڈوبے کا سرمایہ پرستی کا سفینہ''، ''گیا دور

سرمایہ داری گیا''، یہ کلام انقلابِ روس کے اثرات ظاہر کر رہا ہے۔علی سردار جعفری اقبال کی نظم ''ہنر ورانِ ہند'' کے شعر ہند کے شاعر وصورت گر و افسانہ نویس۔۔۔آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار ،کو ترقی پسند ادب کی مقصدیت اور فرائڈ اور ڈی ۔ایچ۔ لارینس کی جنس پرستی سے متاثر جدیدیت پسندوں کی ذہنی کج روی کے خلاف اقبال کی پیش بینی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔علی سردار جعفری اپنے ابتدائی شدّت پسند رویّے سے متوازن اُسلوب کی طرف آئے ،تو انھیں یہ اقرار کرنا پڑا:

> ''اقبالؔ نے فن برائے فن کے رجعت پرست نظریے کی بڑی شدّت سے مذمت کی اور اُسے افیون کی چسکی قرار دیا اور کہا کہ یہ ہم سے زندگی اور قوت چین لینے کا ایک عیارانہ حیلہ ہے۔ اقبال نے آرٹ اور شاعری پر یہ فریضہ عائد کیا کہ وہ جدّ وجہدِ حیات میں ہمارا ساتھ دے۔''[۴]

عزیز احمد نے بھی اقبال کے حوالے سے ادب برائے زندگی کے نظریے کی تائید کی ہے:

> ''اقبالؔ کے نزدیک فن اور زندگی میں تعلق یہ ہے کہ فن انسانی زندگی کی ترقی ، اصلاح اور قوت کا حربہ ہے۔فن کو زندگی کی اندھی تقلید بھی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ بے مقصد حقیقت نگاری کا کوئی حاصل نہیں اور نہ اِس میں کوئی افادیت ہے۔اقبال آرٹ اور افادیت کے اس حد تک قائل تھے کہ اُن کے خیال میں ایسا آرٹسٹ جو کسی قوم کے قوائے عمل کو مضمحل کرنے والا ہو اِس کا سزاوار ہے کہ حکومت کی جانب سے اُس پر تہدید اور ممانعت عائد کی جائے۔ یہ پیش یا افتادہ فقرہ ''فن برائے فن'' جس کی اگرچہ ارسطو کے نظامِ تنقید میں کوئی جگہ نہیں ،لیکن یقیناً اس پر کچھ نہ کچھ اثر یونانی سکونیت کا بھی ہے۔مشرق میں صدیوں تک اس کا رواج رہا۔ شاعری اور ادب کو جانچنے کا معیار زندگی نہیں قرار دیا گیا،بل کہ خیال آرائی، رعایتِ لفظی، ضائع بدائع ،مضمون آفرینی ، ابہام، رقت پسندی ،عربی، فارسی اور ترکی شاعری میں صدیوں تک حاوی رہے پھر ۱۸۵۷ء کے زلزلے کے بعد اُردو ادب اور شاعری نے زندگی اور فطرت سے رشتہ جوڑنا چاہا، تو کچھ عرصے بعد مغرب سے فن برائے فن کے نظریے کی ایک لہر آئی ۔یہ انحطاطی تحریک مشرق اور خصوصاً ہندوستان کی تقلید پسندی کے باعث بہت خطرناک تھی اور جہاں تک مجھے علم ہے سب سے پہلے اقبال نے اِس خطرے کو محسوس کیا۔برّ عظیم میں بیسویں صدی میں اقبال کے بعد دوسری بڑی آواز منشی پریم چند کی ہے جنھوں نے ادب میں حقیقت نگاری کو فروغ دیا اور اُردو ناول اور افسانے کی پوری روایت کو متاثر کیا۔ اُنھوں نے افسانوی ادب کو مثالیت سے نکال کر مقصدیت کی طرف مائل کیا۔''[۵]

اُس دور کا مجموعی طرزِ احساس کیا تھا؟ اُسے جاننے کے لیے اِن نکات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔۱۔۱۹۱۷ء کے رُوسی انقلاب نے ناول نگاروں اور دیگر تخلیق کاروں کو اشتراکیت ،محنت اور سرمائے ایسے موضوعات کی طرف متوجہ کیا۔۲۔ برِ عظیم کے سنجیدہ اور فہمیدہ طبقات میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ سیاسی آزادی کا مطالبہ برحق سہی،مگر سیاسی آزادی اُس وقت تک بے کار ہو گی، جب تک اُس کے ساتھ ہی عوام کی آزادی شامل نہ ہو۔چناں چہ مزدوروں اور کسانوں کو منظّم کرنے کی تحریکیں شروع ہوگئیں۔ اِن تحریکوں نے بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا اور مزدوروں کی مظلومیت ، محنت اور سرمائے کی کش مکش ،کسانوں کی بے کسی ، زمین

داروں اور مہاجنوں کے استحصالی رویّے ایسے موضوعات اُردو ناولوں اور افسانوں میں در آئے ۔ اُس دور میں لکھے جانے والے ادب کے موضوعات پر غور کیا جائے،تو ظاہر ہوگا کہ عصری تقاضوں کے زیرِ اثر سیاسی، قومی اور وطنی مضامین عام ہونے لگے تھے۔خلافت ، آزادی ، غلامی، سرمایہ، محنت ، کاشت کار، زمین داری، اشتراکیت ، بغاوت ، سرمایہ داری ، ملوکیت ،عمل و ایثار ،مستقبل کے بارے میں رجائیت ذوق، یقین و اعتماد ، اقتصادی مساوات ، افلاس ، بے کاری، بے روزگاری، گھریلو زندگی، مذہبی توہمات ، مذہبی طبقے کی ریا کاری، مروجہ رسوم کا کھوکھلا پن اورمعاشرے کے مظلوم طبقوں سے ہم دردی ایسے معاملات اہمیت حاصل کر رہے تھے۔اس صورتِ حال میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر نے ۱۹۳۲ء میں معاشرتی مسائل کی طرف اُردو قارئین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ایک اُردو افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کے عنوان سے پیش کیا۔جو نو افسانوں اور ایک ڈرامے پر مشتمل تھا۔ نظامی پریس لکھنؤ سے چھپنے والی یہ کتاب مغربی ادب سے شناسا باغی نوجوانوں کی متعصب اور روایتی معاشرے کے خلاف بغاوت کی ایک مثال ہے۔اس میں معاشرے میں پائی جانے والی گھٹن کے خلاف احتجاج میں اتنی شدّت تھی کہ ۲۸مارچ ۱۹۳۳ء حکومت کو تعزیزات ہند کی دفعہ ۲۹۵الف کے تحت ضبط کرنا پڑا۔''انگارے'' کی اشاعت اُردو زبان میں ترقی پسند ناول اور افسانے کی روایت اور فروغ کے ضمن میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔امریکی اُستاد اور نقاد ڈاکٹر کارلو کپولا لکھتے ہیں:

''انگارے' کا تاریخ اور نئے ادب کی ترقی پسند تحریک میں خصوصی مقام ہے۔''[۶]

' ریاض احمد ''انگارے'' کی اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایک غیر جانبدار مبصر کو غالباً یہ مان لینے میں کوئی باک نہیں ہوگا کہ ''انگارے'' کی اشاعت کے بعد اُردو ادب میں اُن موضوعات کے لیے دروازے کھل گئے ،جنھیں ترقی پسند تحریک نے اپنے لیے مخصوص سمجھ رکھا ہے۔''[۷]

جوگندر پال نے ''انگارے'' کی فنی ،فکری اور موضوعی جہات کی نشان دہی کی ہے:

''انگارے' کی کہانیاں راست اور بلند بانگ اظہار کرتی ہیں اور اگر چہ فنی اعتبار سے کوئی بہت عمدہ معیار نہیں بنا پائیں، تاہم اِس لیے اِتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ اُردو قارئین کو اُن کے ذریعے پہلی بار ہم عصر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقع فراہم ہوا، اِس کتاب کی بدولت ایک سیدھی لکیر میں لپٹی ہوئی اُردو کہانی ایک دم ہمہ جہت ہونے لگی ، یوں اُس کی موضوعاتی وسعت میں آنے والے دور کی بعض بڑی کہانیوں کے لیے زمین ہموار ہوتی چلی گئی۔''[۸]

ڈاکٹر انوار احمد اِس افسانوی مجموعے کو نفسیاتی اور فنی تناظر میں دیکھا ہے:

''مسلمانوں کے بنیادی معتقدات جس تضحیک کا نشانہ بنے ہیں ۔ وہ محض جھنجھلاہٹ اور جذباتیت کی پیداوار ہیں ۔تاہم اس سلسلے کی بنیادی صداقت یہ ہے کہ'' انگارے'' کے تمام افسانوں کا موضوع ،لب و لہجہ اور فنی رویہ ایک جیسا نہیں ۔''[۹]

پروفیسر احمد علی ''انگارے' کے مصنفین میں ایک ایسا حوالہ ہیں۔جنھوں نے بعد میں ناول،افسانے ،تنقید اور تدریس میں نام کمایا۔'' انگارے'' کی اشاعت پر ہونے والے ردِّعمل کے حوالے سے احمد علی کا کہنا ہے:

''انگارے کی اشاعت سے ملک میں آگ لگ گئی تھی۔ تقریباً چھوٹے بڑے سب ہی رسالوں میں حتی کہ 'مدینہ' اور 'سرفراز' جیسے کثیر الاشاعت اخباروں نے جذباتی ہیجان میں ڈوبے ہوئے اداریے اور مضمون لکھے۔''[۱۰]

''انگارے'' کوفنی کم زوریوں کے باوجود اپنی تاریخی اور فکری اہمیت کے سبب فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ادب اور معاشرے پر تنقید کا یہ انداز بعد میں اُردو ناولوں اور افسانوں میں ایک واقعیت پسند اور حقیقت نگار روایت کی شکل اختیار کر گیا۔''انگارے'' روایتی کتھن میں ایک نئی اور باغیانہ سوچ کو متعارف کرانے کی ایک معنی خیز علامت بن گیا۔ پھر یہ کہ'' انگارے'' کے مصنفین نے اِس کتاب کے خلاف انتہائی شدیدردِّعمل پر اِس کے دفاع میں جوحوصلہ مند تحریر شایع کی ، اُردو میں ترقی پسندادب کے تعارف اور فروغ کے ضمن میں اسے ایک سنگِ میل کہا جا سکتا ہے۔ ۵/اپریل ۱۹۳۳ء کو روز نامہ ''لیڈر'' الہ آباد میں یہ تحریر شائع ہوئی :

''اِس کتاب کے مصنف اِس کی اشاعت پر کسی طرح نادم نہیں۔ شائع ہونے کے بعد کتاب کی اپنی خوبیوں پر مبنی ہے کہ وہ زندہ رہے یا نہ رہے۔ وہ کتاب شائع کرنے کے انجام سے بھی نہیں ڈرتے۔ وہ اتنا چاہتے ہیں کہ نہ صرف اس کتاب،بل کہ ایسی اور کتابیں شائع کرنے کے حق کا تحفظ باقی رہے۔ اُن کا موقف ہر اُس مطالعے اور امر میں ، جو بنی نوع انسان اور خاص کر ہندوستان کے باشندوں کے لیے افضلیت اور اہمیت رکھتا ہے آزادیء تنقید اور آزادیء رائے کے اظہار کا حق اور اِس کا تحفظ کریں۔' انگارے' کے مصنفوں نے اسلامی معاشرے کا انتخاب اِس لیے نہیں کیا کہ وہ اِس سے کسی قسم کا بغض وعناد رکھتے ہیں،بل کہ اس لیے کہ وہ خود اِسی معاشرے میں پیدا ہوئے ،اِس سے بخوبی واقف ہیں ۔ اِس کی صحیح ترجمانی اور عکاسی کر سکتے ہیں۔اِس کتاب یا اس کے مصنفوں پر جو کچھ بھی گزرے ہمیں امید ہے کہ دوسرے اِس بات سے پست حوصلہ نہ ہوں گے۔ ہماری عملی تجویز یہ ہے کہ فوری طور پر ایک'' لیگ آف پروگریسو آتھرس'' قائم کی جائے۔ جو اس قسم کی مجموعے وقتاً فوقتاً انگریزی اور ملک کی دوسری مقامی زبانوں میں شائع کرے۔''[۱۱]

اِس وضاحتی بیان سے اُس دور میں معاشرے کی تبدیلی کا عزم رکھنے والے نوجوانوں کے جذبات کا اظہار اور ترقی پسند تحریک کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ''انگارے'' کے مصنفین معاشرے میں ذہنی آزادی اور انسانی حقوق کے لیے بہت سوچ سمجھ کر ایک آواز بلند کرنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی جذباتی یا ہنگامی معاملہ نہیں تھا۔وہ آزادیِ رائے کا اتنااحترام کرتے تھے کہ اس کے لیے کسی بھی قربانی کے لیے تیار تھے۔اُن کا مقصد عریانی اور فحاشی کا پرچار نہیں، معاشرے کی گھٹن کو ختم کرنا ،تعصب اور رجعت پسندی سے معاشرے کو آزاد کرانا تھا ۔ وہ بغیر کسی لالچ اور خوف کے ایک ترقی پسنداور روشن خیال تبدیلی کے لیے کام کرتا چاہتے تھے جس سے انسانیت کی خدمت ہو سکے۔ وہ ادب کو معاشرے میں بلواسطہ تبدیلی کا وسیلہ خیال کرتے ہیں۔اِسی لیے سماجی کم زوریوں پر تنقید کا حق مانگ رہے تھے۔ وہ کسی مخصوص طبقے کی مخالفت یا پروپیگنڈا نہیں کر رہے تھے۔ اُن کی منزل عظمت انسان اور معاشرے میں خوش گوار ماحول کے لیے کام کرنا تھا۔وہ اپنی سوچ کو مربوط انداز میں عوام تک پہنچانے کے لیے ایک تنظیم کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔''انگارے'' کے مصنفین نے بلاشبہ لوگوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کیا ،مگر اِس کے ساتھ ساتھ انقلابِ روس اور پھر رام موہن رائے، ٹیگور، دادا بھائی نوروجی، مسز اینی بیسنٹ ،لالہ لاج پت رائے، ارو بندوگھوش ، پنڈت نہرو، عبید اللہ سندھی ، پریم چند ،

اورعلامہ اقبال جیسی بااثر، باعلم اور معاشرے کے مختلف طبقات کی نمایندگی کرنے والی اہم شخصیات کی مارکسزم میں کسی نہ کسی سطح کی دل چسپی نے بھی برِّعظیم میں ترقی پسند فکر متعارف کرانے میں بہ ہر حال ایک کردار ادا کیا۔جواہر لال نہرو نے ۱۹۲۸ء میں اشتراکی روس کے بارے میں لکھ رہے تھے:

''ساری دُنیا اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔بعض خوف ونفرت سے اور دوسرے اُس راستے کو اختیار کرنے کی اُمید اور خواہش کے ساتھ۔'' ۱۲

اُس دور میں ترقی پسندفکر کی مقبولیت کے حوالے سے سجاد ظہیر کا یہ تجزیہ بھی قابلِ توجہ ہے :

''۱۹۳۰ء کے چند سال بعد سوشلزم کا نظریہ درمیانے طبقے کے دانش وروں میں پھیل گیا۔ملک کی سب سے بڑی جماعت کانگریس میں،بائیں بازو کی سیاست واضح طور پر نمایاں ہونے لگی۔نہرو نے اپنی سوانح حیات اور مضامین میں سوشلزم کی کھلے الفاظ میں تائید کرنا شروع کی۔ کیمونسٹ پارٹی کے علاوہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی بھی قائم ہوئی،نوجوان بھارت سبا،یوتھ لیگیوں نے بھی سوشلزم کو اپنایا۔ طلبہ کی جو تنظیم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام سے بنیں زیادہ تر بائیں بازو کے اثر میں تھیں ۔اُس زمانے میں کسانوں کی علیحدہ تنظیم کسان کمیٹیوں اور کسان سبھاوں میں شروع ہوگئی ۔یہ بھی سوشلسٹ اور کمیونسٹ کارکنوں نے قائم کی تھیں۔'' ۱۳

مندرجہ بالا آرا کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس وقت برِّعظیم میں ترقی پسند نظریات میں دل چسپی بڑھ رہی تھی۔ اِس مرحلے پر جوش ملیح آبادی کی بلند آہنگ شاعری نے بھی انقلابی تصوّرِ ادب کو جلا بخشی اور وہ شاعرِ شباب سے شاعرِ انقلاب ہوگئے ۔ سیاست، ادب اور معاشرے کے دیگر شعبوں میں ترقی پسندا فکار نے اثر دکھانا شروع کردیا تھا۔ اِسی دوران میں اکتوبر۱۹۳۴ء میں ہندی اور جولائی ۱۹۳۵ء میں اُردو میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مضمون''ادب اور زندگی'' شائع ہوا۔جس نے ادبی حلقوں میں نئے مباحث کوجنم دیا۔ اِس مضمون میں ترقی پسند نقطہءنظر سے ادب کا جائزہ لیا گیا تھا۔اِس مضمون میں جو سوالات اٹھائے گئے، وہ گویااُردو ادب میں ترقی پسند ادبی نظریات کی بنیاد ہیں۔ترقی پسند تحریک نے اِنھی سوالوں پر اپنی تنظیم کی عمارت کھڑی کی جو اُس وقت اختر حسین رائے پوری اور دیگر ترقی پسند اہلِ ادب کے ذہنوں میں تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے اِس مضمون میں ادب اور زندگی کے رشتے، ادیب کی سماجی اہمیت ، ادب کے الہامی ہونے کی بجائے ماحولی ہونے، ادب کے فرائض اور مقاصد جیسے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا۔انھوں نے ادب برائے زندگی کے نظریے پر زور دیا۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان کہتے ہیں۔اُن کے نزدیک ادب اور زندگی کے مقاصد ایک ہیں:

''صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اِس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اِس سے اثر قبول کرسکیں۔ اُس کے دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے سے پیدا ہونا چاہیے ،کیوں کہ یہ پیغمبری کی طرح خودگزاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور، ماضی، حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لیے ضروری ہے ،تاکہ اُس کی دردمندی رائیگاں نہ جائے اور تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے۔ پھر زندگی کو اُسی وقت سمجھا جا سکتا ہے، جب اُس کی آگ میں تپا جائے اور اُس کی آگ میں حصّہ لیا جائے اور اُس کی تگ و دو سے الگ رہ کر اُس کی رموز کو

سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا۔''[۱۴]

اِس مضمون کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر محمّد دین تاثیر، ، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، پروفیسر احمد علی اور دیگر ترقی پسند سوچ رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کی مسلسل کوششوں سے ترقی پسند فکر ایک تنظیم اور تحریک کی صورت اختیار کر نے لگی۔اپریل ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔اس کانفرس میں ترقی پسند وں نے پہلی بار ایک پلیٹ فارم سے رجعت پسند، سرمایہ دار، تنگ نظر اور غلامانہ ذہنیت سے نجات دلانے کی آواز بلند کی۔ ترقی پسند مصنفین نے معاشرے اور ادب میں ایسی تبدیلی لانے کی خواہش کا اظہار کیا جس میں انسان اپنے بنیادی حقوق سے بہرہ ور ہو سکے۔

اِس کانفرنس میں صدارت کے لیے منشی پریم چند سے درخواست کی گئی۔جو اُس وقت اُردو اور ہندی کے ایک ممتاز اور مستند بزرگ ادیب تھے۔اِس موقع کے لیے اُن کا انتخاب بہت موزوں تھا۔پریم چند اُس زمانے میں بنارس میں ادیبوں کی ایک انجمن ''لیکھک سنگھ'' بنا چکے تھے، جس کے مقاصد وہ ہی تھے، جو بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنائے۔ پریم چند فکری حوالوں سے عظیم روسی ناول نگار لیو تالستائی اور مہاتما گاندھی سے بے حد متاثر تھے۔یہ ہی وجہ ہے کہ اُن کے نظریات اور تخلیقات رومانی آدرش سے حقیقت نگار، انسان دوست فکر میں ڈھل رہے تھے۔ پریم چند نے اِس کانفرس کے یادگار صدارتی خطبے میں ترقی پسند ادبی نظریات کی مکمل وضاحت کی انھوں نے ترقی پسند فکر کی روشنی میں جس مربوط اور مبسوط طریقے سے اپنا مدّعا بیان کیا، اُس کی وجہ سے یہ خطبہ اُردو کی ایک اہم تنقیدی دستاویز بن گیا ہے۔

پریم چند نے اپنے اِس خطبے میں ادب اور ادیب کی ذمہ داریوں اور مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ادب میں عصری شعور اور فنی محاسن دونوں پر زور دیا۔اُن کی نظر میں ادیب کا کردار، انسانیت، علویت، اور شرافت کا علم بردار ہونا چاہیے۔ وہ ادیب سے محروم اور مظلوم طبقات کے لیے آواز اٹھانے کی توقع بھی کرتے ہیں۔ ایک نئی اخلاقی ا ور سماجی معنویت تخلیق کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جارہا ہے۔ پریم چند نے ادب کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا:

> ''ادب اُسی تحریر کو کہیں گے، جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اُسی حالت میں پیدا ہوتی ہے، جب اِس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کیے گئے ہوں۔''[۱۵]

اپنی اپنی حدود میں فنی اظہارات کی ان اصناف میں جو بھی فرق ہو، اُن کا بنیادی امتیاز ی عنصر، جو انھیں تمام افادی مظاہر سے ممتاز بناتا ہے، وہی شے ہے جس کے عمل پیرا ہونے سے، مادے کی صورت تبدیل ہو جاتی ہے، مگر فن کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں۔حسن کی طرح فن بھی کوئی مادی جسمانی شے نہیں ہے کہ اس کی شکل و جسامت کو محض حواسِ ظاہری سے دیکھا جا سکے۔ یہ الفاظ، اصوات یا رنگوں کو جوڑ کر بنائے جانے والی ایک ذوقی کیفیت ہے جس میں اصل شے تو حسی تجربہ ہی ہے، مگر اُسے محسوس کرنے کے لیے ذہنی حاسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح حسن کی ماہیت کو بیان کرنے کے لیے کسی حسین شے کے اوصاف و کیفیات کا بیان ضروری ہے، اسی طرح فن کے بیان میں بھی ناول، افسانہ، تصویر، مجسمہ یا شعر جیسی فنی وضعوں کے اُن مظاہر کا بیان

ضروری ہوتا ہے، جن میں فن مضمر ہوتا ہے۔ اِس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہوتی ہیں،ایک تو یہ کہ حسن اورفن ایک خارجی حقیقت ہوتے ہوئے بھی اپنے انتقادی معیارات کے اعتبار سے ایک موضوعی اور داخلی معاملہ ہے، لہٰذا اُس کے وصف ، وظیفے اور طریقِ کار کے بارے میں کوئی بھی نقطہ ءنظر اختیار کیا جائے،اُس میں کسی حد تک انفرادی رائے کا آجانا ممکن ہے۔ جو آدمی فنون کی ماہیت ، اوصاف ، تفاعل اور طریقِ کار کی بحث میں اسے بڑی حد تک قائم بالذات کہتا ہے ۔وہ ایک مخصوص حسّیت کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

پریم چند کے معنی خیز خطبے میں زندگی کو سمجھنے کے حوالے سے داخلی اور موضوعی تجربے کی نسبت معروضیت کو ترجیح دی گئی۔اُنھوں نے روایتی تصوّرِحسن کو مسترد کرتے ہوئے ،اُس تصوّرِحسن کی طرف توجہ دلائی جس میں انسان اور اُن کے مسائل کو بھی پیش کیا جائے۔وہ ادب کو سیاسیات اور وطینت کے پیچھے رکھنے کی بجائے اُن سے آگے رکھنا چاہتے ہیں۔ پریم چند کا یہ تاریخی خطبہ ہو، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مضمون یا ان سے پہلے ''انگارے'' کے دفاع میں شائع ہونے والی تحریر،تینوں میں ادب کو معاشرے میں تبدیلی لانے کے لیے ایک وسیلہ تصوّر کیا گیا ہے۔گویا ادب کو زندگی کی ترجمانی اور اصلاح کی قابلِ قدر ذمہ داری دی گئی۔ معاشرے میں بھوک ،افلاس، اخلاقی پستی، بے بسی ،توہم پرستی ،بے بنیاد روحانیت اور اندھی تقلید جیسے مسائل کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یہ منشور پیش کیا گیا:

> '' ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے ،لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدّن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اِس لیے ہندوستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پسند رجحانات اُبھر رہے ہیں ،اُن کی ترجمانی کریں اور اُن کی نشو ونما میں پورا حصّہ لیں ۔ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی بین اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصوّر پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ اِس کے عناصر وقویٰ مضمحل ہوگئے ہیں اور اُس کا پتہ اِس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پسندوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور اُن کو عوام کے دکھ اور جدو جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اِس دور میں کوشاں ہے۔ ہم ہندوستانی تمدّن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اِس لیے زندگی کے جس شعبے میں ردِعمل کے آثار پائیں گے اُنھیں افشا کر دیں گے۔ ہم اِس انجمن کے ذریعے ہرایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے۔ جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہ تر زندگی کی راہ دکھائے گا۔ اس کا م میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب وتمدّن سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیاادب ہماری زندگی کی بنیادی مسائل کا اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک افلاس سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں ناچاری سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جارہے ہیں۔ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور ارادوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں''۔[۱۶]

اِس فکر انگیز اور تغیّر پسند منشور کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ملک کے لیے آزادی کی کوشش، آزادیء رائے اور آزادیء خیال کی حفاظت کو اپنا مقصد قرار دیا۔ معروف نقاد مجنوں گورکھ پوری نے اِس نئے اندازِ نظر کے لیے ''ترقی پسند'' کی اصطلاح استعمال کرنے کی مخالفت کی ،اُنھوں نے ترقی پسند کے بجائے ''پیش قدم'' کی اصطلاح تجویز کی، جسے قبول نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید اِس منشور پر خاصے عجیب اعتراضات کیے ہیں:

''اِس اعلان نامے پر نظر ڈالیں تو یہ بے حد خوش آیند نظر آتا ہے۔ اِس میں ادب کو نسلی تعصب، فرقہ پرستی اور انسانی استحصال کے خلاف استعمال کرنے اور اسے عوام کے قریب تر لانے کا عہد بھی نمایاں ہے۔ اِس میں سائنسی شعور بیدار کرنے کا جذبہ بھی موجود ہے، اِس بات سے کوئی ذمہ دار ادیب انکار نہیں کرسکتا کہ ادیب کا تصوّر معاشرے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ اس کی خامیوں اور خوبیوں سے نہ صرف واقف ہوتا ہے، بل کہ اُن کا تاثر بلواسطہ طور پر اُس کی تخلیقات میں بھی سما جاتا ہے اور یوں معاشرے کو آہستہ روی سے تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا اعلامیہ ہندوستانی مصنفین کو معاشرے کی بہ ترین روایات کا وارث قرار دیتا ہے تاہم اس میں خاندان، مذہب اور جنس کو مروجہ روایات پر ضرب لگانے کا رجحان بھی موجود ہے اور یہ ایک ایسا معاشرہ مرتب کرنے کی دعوت دیتا ہے، جس میں خاندان ،مذہب اور جنس کی عائد کردہ پابندیوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھنے کی آزادی ہو۔ اس اعلان نامے نے موجود کی ہیئتِ ترکیبی کو منتشر کرنے کا اہتمام تو کیا، لیکن اِس انتشار سے نئی تعمیر ابھارنے کی سعی نہیں کی نتیجۃً وہ منزل جسے پانے کی آرزو ترقی پسند تحریک نے کی تھی۔ عرصے تک خیالی سرابوں میں گم رہی اور ادبا ایک دل آویز رومانی خواب میں ہلکورے لینے لگے ۔ چناں چہ انقلابی تبدیلی اور ترقی کیقابلِ قدر جذبات کے باوجود اس اعلان کے اجمال میں اجتماع ضدین بھی موجود ہے۔ پریم چند کے صدارتی خطبے اور ترقی پسند تحریک کے لائحہ عمل میں بُعد المشرقین تھا اوّل الذکر ادب کی مشرقی قدروں کو اُجاگر کرنا تھا۔ فرد کی تخلیقی آزادی کو برقرار رکھتا تھا اور اُسے سیاست کے تابع فرمان ہونے کا مشورہ نہیں دیتا تھا۔ جب کہ مؤخّرالذّکر انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے خارجی سطح پر متحرک ہونے اور ادب و جمالیات کا نیا مشرقی مفہوم پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ چناں چہ کانفرنس کے خاتمے پر جب منشور کو معمولی ردّ و بدل کے بعد منظور کر لیا گیا ،تو اس میں منشی پریم چند کے خطبہء صدارت کی بازگشت موجود نہیں تھی۔'' ۱۷

ڈاکٹر انو رسدید نے ترقی پسند تحریک کے اِس منشور کے حوالے سے جو اعتراضات کیے ہیں، وہ یک طرفہ اور بے بنیاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اعلان نامہ پریم چند کے خطبے سے قطعاً مختلف نہیں، دونوں تحریروں میں ادب کو سماج کی حالت بدلنے کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ دونوں تحریروں میں ادب کے ترقی پسند نقطہء نظر کی وضاحت، ضرورت اور اہمیت بیان کی گئی ہے ۔ دونوں تحریروں میں کسی قسم کا کوئی نظریاتی یا اصولی اختلاف نہیں ۔ ڈاکٹر انو رسدید کے برعکس ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اِس اعلان نامے اور اُس ماحول کا حقیقت پسندانہ انداز میں جائزہ لیا ہے:

'' یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ اِس صدی کے تیسرے عشرے میں رُونما ہونے والی معاشی اتھل پتھل نے اِس صدی

کے انسان کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا، جب اخبارات کے تجارتی اور مالیاتی امور سے متعلق صفحات یک بہ یک اہم ہو گئے ۔ کلاسیکی معاشیات کے بڑے بڑے ستون تیزی سے گرنے لگے اور اس شکست ور یخت کے پسِ پشت سیاسی ہاتھ اِس درجہ واضح ہوگئے کہ ادب کی وہ ساری تعریفیں جو غزل میں تغزل اور مواد کو ہیئت سے علیحدہ نہ خیال کرتی تھیں، غلط ثابت ہونے لگیں۔ ایک طرف یورپ میں ٹامس مان نے کہا کہ 'اِس دور کا مقدّر سیاسی ہے' تو دوسر ی طرف منشی پریم چند نے (ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۶ء) میں اِس خیال افروز حقیقت کا اعلان کیا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔''[۱۸]

لکھنؤ میں ہونے والی یہ کانفرنس اپنے نظریات کی اہمیت اور حالات کے تقاضوں کی وجہ سے کا م یابی سے ہم کنار ہوئی، کیوں کہ اِس طرح کی عوام دوست آواز اِس سے پہلے اِس اہتمام سے برّعظیم میں کبھی عوام کے سامنے بلند نہیں کی گئی تھی۔ رالف رسل نے ترقی پسند تحریک کے ردّعمل کے بارے میں لکھا ہے :

''تحریک کے مخالف پریس کو بھی ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی کام یابی کے بعد اس تحریک کو کافی جگہ دینی پڑی اور توجہ صرف کرتا پڑی۔''[۱۹]

ادب سمیت تمام فنون زندگی کی تہذیبی جہت کا مظہر ہوتے ہیں یا یہ قائم بالذات اور مقصود بہ خود ہیں؟ جن کی حیثیت ، قدر اور تفاعل کا تعین کسی اور شے کی بنا پر نہیں ،بل کہ اُن کے آزادانہ وجود سے ہونا چاہیے؟ ترقی پسند فکر میں اِس سوال کا جواب یہ ملتا ہے کہ ادب سمیت تمام فنون زندگی اور تہذیب کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ اِس لیے فنون کو انسان دوست اور معاشرے کا عکاس ہونا چاہیے۔ اِس میں یاسیت کی بجائے رجائیت ہونی چاہیے۔ ترقی پسند تحریک کی رجائیت ، اصل میں انسان دوست اقدار سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کی معاشرے کی اعلیٰ تہذیبی اور سماجی اقدار سے ایک نئے تصوّرِ حسن کا اظہار بھی تھا، جو قبائلی یا جاگیرداری تہذیب میں ممکن ہی نہیں تھا۔ عارف عبدالمتین نے ترقی پسند تحریک کے سماجیاتی حوالے کو بنیاد بنایا ہے:

''۱۹۳۵ء میں جب ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو اُس نے کھلے الفاظ میں اِس بات کا اعلا ن کیا کہ ہر ادیب ایک سماجی وحدت ہے لہٰذا اُس کا سماج سے رشتہ ناگزیر ہے۔ کوئی ادیب اس سماج سے کٹ کر ادب پیدا نہیں کر سکتا، جس میں وہ زندگی گزارتا ہے ۔ اس اعلان نے ادب اور سیاست کے باہمی رابطہ کو بڑا نمایاں کر دیا، کیوں کہ سماج میں سیاست زبردست اہمیت کی حامل ہے۔ جو ادب اپنے بڑوں کو سماج میں پیوست سمجھتا ہے وہ اِس سے گہری وابستگی کے بغیر اپنے وجود کا جواز مہیّا نہیں کر سکتا ۔ترقی پسند مصنفین نے جب اِس اعلان کو رگِ جان سمجھتے ہوئے اِس پر شدّت سے عمل کرنا شروع کیا، تو ان تحریرات کا دامن بڑا وسیع ہو گیا۔ اُس نے نہ صرف ہندوستانی سوسائٹی کے جملہ اندرونی عیوب کا احاطہ کیا، بل کہ اُنھیں چن چن کر بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، بیرونی سام راج کی چیرہ دستیوں کے خلاف نہایت مضبوط مورچہ قائم کر دیا وہ قدم قدم پر استعمار پسندی سے الجھنے اپنے ملک کو سال ہاسال کی نکبت سے چھٹکارا دلانے کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ یہ ایک بہت بڑا فریضہ تھا۔ جو انھوں نے اپنے ذمے لیا اِس فریضے کی ادائیگی ان کے لیے باعثِ افتخار تھی۔ اِس لیے اُنھوں نے اِس افتخار کے

حصول کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔'' [۲۰]

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ایک بہت سنجیدہ اورادب کوتہذیبی تناظر میں دیکھنے والے اُستاد اور نقاد مانے جاتے ہیں،ترقی پسند تحریک کے تہذیبی وفکری جہت کے حوالے سے اُن کا یہ غیر جانب دارانہ تجزیہ بہت اہم ہے:

''ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اُس نے رومانی تحریک سے جذبے کا زوروشور لیا اور اُسے حالی کی مقصدیت کے ساتھ ملا کر اپنے نظریات کے تابع کیا۔چوں کہ ترقی پسند تحریک کے پیچھے بھی ایک پورا فلسفہء حیات تھا، اِس لیے اُس نے بھی ایک قسم کی فکری و احساساتی وحدت پیدا کی۔ اِس فلسفہء حیات کی بنیاد مادی حقائق پر تھی۔ اِس لیے اُس کی جہت افقی تھی۔ تاہم اس تحریک نے بھی جمالیات اور اخلاقیات کی ایک وحدت قائم کی۔ترقی پسند تحریک نے معاشرے کے رستے ہوئے زخموں کی نمایش کی تو اس کے دو جواز پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ ایک اخلاقی اور دوسرا جمالیاتی۔اخلاقی طور پر معاشرتی بدعنوانیوں پر طنز اور ان کا انکشاف اور جمالیاتی طور پر یوں کہ ارسطو کے نظریہ تقلید کے مطابق بد ہیئت اشیاء کی تصویر بھی مسرّت بخش ہوتی ہے۔ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں ایک اور بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رجائی پہلو کی حامی رہی اور زندگی کی نفی کرنے والے خوف و ہراس ناامیدی اور آشوب کو ادب سے دور رکھا۔'' [۲۱]

اصغر علی انجینیر سماجی اور مذہبی علوم پر گہری نظر رکھنے والے ایک مارکسی نقاد ہیں۔ ادب ،زندگی اور وابستگی کے تئیں ترقی پسند نقطہء نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' ہمیں یہ بات اچھی طرح یاد کرلینی چاہیے کہ فکری جہت اور کمٹ منٹ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ،ہر فکر کی جہت اپنے اندر کمٹ منٹ کا عنصر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ میرے نزدیک جینا جو ایک حیاتیاتی عمل ہے ،خود زندگی سے کمٹ منٹ ہے اور زندگی سے کمٹ منٹ اِس کو زیادہ فعال، زیادہ بامعنی اور زیادہ خوب صورت بنانے سے کمٹ منٹ ہے اور اِسے زیادہ خوب صورت فعال اور بامعنی بنانے کا عمل خود ایک نظریاتی فوکس کا مقتضی ہے۔ اِس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ زندگی سے کمٹ منٹ دراصل اِس کو خوب صورت اور بامعنی بنانے والے نظریے سے کمٹ منٹ ہے آخر انسان اپنے عمل کے لیے کسی نہ کسی نظریے سے ہی فیضان حاصل کرتا ہے۔ یہ نظریہ مذہبی ہوسکتا ہے سیاسی بھی اور ادبی بھی۔ اِس لیے کمٹ منٹ سے انکار، دراصل نظریے سے انکار نہیں، زندگی سے انکار ہے۔ وہی شخص کمٹ منٹ کا منکر ہوگا، جو زندگی کی ضرورت اور معنویت کا ہی منکر ہے، یہاں ایک اور بات پر زور دینا ضروری ہے، کیوں کہ اس پر ترقی پسند تحریک کے پھلنے پھولنے کا انحصار ہے اور وہ یہ کہ کمٹ منٹ ہر آدمی کے لیے عموماً اور رائٹر کے لیے خصوصاً اندھا کمٹ منٹ ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہیے ۔اندھا کمٹ منٹ نہ صرف الفاظ کا زبردست تضاد ہے،بل کہ خود زندگی اور زندگی کے دیے ہوئے نظریے کا مذاق ہے۔کسی بھی نظریے سے یا مذہبی سیاسی اور ادبی موقف کواختیار کرنے سے قبل اِس کا بھرپور انتقادی جائزہ لینا بہت ضروری ہے اور یہ جائزہ اُن اقدار کی روشنی میں لینا ضروری ہے جو اقدار زندگی کوتخلیقی عمل سے مالا مال بنانے کی ضامن ہیں۔'' [۲۲]

ترقی پسند تحریک کی بنیادی خصوصیات؛ اعلیٰ اقدار سے وابستگی ،حقیقت نگاری، ادب کے ذریعے سماج کو بدلنے کے تصوّرات انسانی فطرت سے بہت قریب ہونے کے ناطے ادب میں زمانہ ء قدیم سے کسی نہ کسی صورت راہ پاتے رہے ہیں۔ اِس تحریک کے اہم کرداروں کی دین یہ ہے کہ اُنھوں نے مذکورہ تصوّرات کو مربوط اور مدلّل انداز میں پیش کیا۔جرمن فلسفی کارل مارکس کے انقلابی نظریات کو بنیاد بنانے والا اقتصادی نظام،جس میں اینگلز اور لینن سمیت کئی اورفلسفیوں،دانش وروں، سیاست دانوں اور لکھاریوں کے افکار شامل ہیں مارکسزم کہلاتا ہے۔مارکسزم اصلاً تو ایک ایسا نظامِ فکر ہے جس میں سماجی ارتقا کو سائنسی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ،جو وقت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی پھیلاؤ کے باعث ایک نظریہء حیات کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ایم ۔این۔ رائے نے بھی مارکسزم کو پوری زندگی کو محیط فلسفے کے طور پر دیکھا ہے:

''مارکسیت میں معاشی نظریے،سیاسی مسائل اور سیاسی عمل کا پروگرام شامل ہے،کیوں کہ مارکسیت زندگی کا فلسفہ ہے،فلسفہء حیات ہونے کی حیثیت سے اِسے زندگی کی ہر سرگرمی کا حامل ہونا چاہیے۔'' ۲۳

ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے ترقی پسند ادب کے مارکسی پس منظر کو اِس طرح واضح کیا ہے :

''بیسویں صدی میں انقلابِ روس کے بعد مارکسی نظامِ فکر کا چرچا ہوا،تو ادب اورفن میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا اور'فن برائے زندگی' کے نظریے کو ایک نئی تاویل اور نئی تاکید کے ساتھ پیش کیا گیا۔ادب اورفن کا مقصد معاشرے میں انقلابی اورترقی پسند قوتوں کی ہم نوائی قرار دیا گیا ۔اِس تاویل کے مخالفین نے اعتراض کیا کہ ادب اورفن کو پروپیگنڈے کے حربے کے طور پر استعمال کرنا غلط اور ناجائز ہے۔یہ اعتراض اِس حد تک تو درست ہے کہ ادب اور فن سیاسی پلیٹ فارم کی قسم کے پروپیگنڈے کے متحمل نہیں ہوسکتے،کیوں اُن کے اپنے اسالیبِ اظہار میں فنی حُسن اور جمالیاتی اقدار کا قائم رکھنا ضروری ہے ورنہ وہ زرِکم عیار ٹھہرائیں جائیں گے اور اپنا مقام و مرتبہ کھو بیٹھیں گے ،مگر اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ادیب اورفن کار محض اپنی صناعی کے حسین وجمیل مرقّعے پیش کرتے رہیں اور اپنے گردوپیش کی زندگی اور حالاتِ زمانہ سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور اُن کے بارے میں ردّو قبول اور پسندو ناپسند کا اظہار نہ کریں۔ادیب یا فن کار کے لیے اِس ذمے داری سے کوئی مفر نہیں ۔'' ۲۴

مارکسزم نے جہاں ادیب میں مثبت اقدار سے وابستگی کی راہ سُجھائی ،وہاں معاشرے میں طبقاتی امتیاز ختم کرنے اور دولت کی مساوی تقسیم کا ایک نظریہ بھی پیش کیا، اِس نظریے اورترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد میں کوئی تضاد نہیں تھا۔اِسی لیے یہ تحریک مارکسزم سے متاثر ہوئی۔ ترقی پسند فکر میں حال اور مستقبل کی بے حد اہمیت کے پیشِ نظر بعض حلقوں کی جانب سے الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نظریے میں ماضی کی کوئی اہمیت نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند فکر اور مارکسزم دونوں ماضی کی روایات کے تسلسل کا نتیجہ ہیں۔مارکس کا جدلیات کا تصوّر ہو یا انسانی بھلائی اور خدمت کا تصوّر یہ کوئی خلائی یا خیالی بات نہیں ہے۔مارکسزم کے پرچارک ماضی کی مثبت روایات سے تعلیم حاصل کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ مارکسزم یا ترقی پسندفکر ماضی کو دوبارہ رائج کرنے کے حق میں ہرگز نہیں،مگر اِس سے عبرت یا سبق حاصل کرنے سے انکاری نہیں ۔ترقی پسندفکر میں ماضی کی کیا اہمیت ہے، مجنوں گورکھ پوری اِس موضوع پر روشنی ڈالی ہے:

''سچ ہے کہ حال سے باہر ماضی کے کوئی معنی نہیں ہوتے اور اِس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہے کہ ماضی سے بے تعلق ہو کر حال اور مستقبل دونوں دھوکے ہیں۔ ہر مستقبل کا ایک ماضی اور ہر ماضی کا ایک مستقبل ہوتا ہے ہم کسی ایسے ماضی کا تصوّر نہیں کر سکتے جو مستقبل کی پیش رس جھلک اپنے اندر نہ رکھتا ہو نہ ایسا مستقبل ہماری سمجھ میں آتا ہے جس میں ماضی کے زندہ صالح برق پارے پوشیدہ یا نمایاں طور پر کام نہ کر رہے ہوں۔''[۲۵]

ڈاکٹر عبد العلیم نے بھی اُس عمومی تأثر کی نفی کی ہے، جو ترقی پسند فکر کے مخالفین کی طرف سے دیا جاتا ہے کہ ترقی پسند فکر اور تخلیقات میں ماضی کو مسترد یا نظر انداز کیا جاتا ہے:

''مارکسزم کے بڑے نمایندوں نے ہمیشہ انسانیت کے قدیم ورثے کو عزّت کی نظر سے دیکھا ہے اور برابر اِس کا ذکر کیا ہے یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ مارکسزم کے معیاروں نے قدیم ورثے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔''[۲۶]

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ برّعظیم میں ترقی پسند فکر نے ایک بالکل نیا تصوّرِ ماضی، تصوّرِ انقلاب، تصوّرِ ادب اور تصوّرِ زندگی دیا۔ اُس فکر نے پرانی روایات پر نظرِ ثانی کا حوصلہ پیدا کیا اور نئی روایات کی داغ بیل ڈالی۔ ادب کی سماجی جہت پر بہت زیادہ زور دیا، جس سے بعض لکھنے والوں نے اختلاف بھی کیا۔ وارث علوی کا یہ اعتراض بے جا نہیں:

''آپ ذرا ادب اور آرٹ کی تاریخ پر نظر کیجیے اور بتایئے کہ دُنیا میں ادب اور آرٹ کس قدر 'سماجی' ہے۔ ادب زندگی کے تجربات کا بیان ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ یہ تجربات تمام کے تمام بنیادی طور پر 'سماجی' ہوتے ہیں، ہماری سادہ لوحی ہے۔''

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک میں صرف کمیونسٹ اور بائیں بازو کے افراد شامل تھے۔ یہ تأثر درست نہیں ہے۔ اس تحریک میں مختلف فکری پس منظر رکھنے والے لوگ شامل رہے ہیں۔ اس تحریک میں جہاں سجاد ظہیر اور اُن جیسے کمیونسٹ نقطۂ نظر رکھنے والے دیگر ادیب شامل تھے۔ وہیں اِس تحریک کے حامیوں میں حسرت موہانی، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، اور مولانا عبد المجید سالک وغیرہ بھی شامل تھے۔ پاکستان بننے کے پہلی ترقی پسند کانفرنس کی صدارت حفیظ جالندھری نے کی تھی۔ جنھیں ٹراٹسکی کے لفظوں میں Fellow Travellers کہنا مناسب ہوگا۔

اِس تحریک کے تنظیمی سطح پر خاتمے میں خود ترقی پسند ادیبوں کی غلطیوں کے علاوہ پاکستان میں دائیں بازو کی حامی حکومتوں کے شدید دباؤ کا بھی عمل دخل ہے۔ جارج اورویل کے تئیں دھوکا دہی کے دور میں سچ بولنا بھی ایک انقلابی قدم ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کو سچ بولنے کے جو نتائج بھگتنے پڑے، اُن سے صرفِ نظر کرنا ناانصافی ہے۔ تقسیم کے فیصلے کے بعد انگریزوں نے جب پس خوردہ برّعظیم سے محفوظ واپسی کے لیے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے کثیر جہتی تصادم میں اپنا فائدہ جانا، تو ترقی پسند حلقوں نے اِس سے بچنے کے لیے ہر ممکن کوششیں کیں۔ کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین دونوں نے اس موقع پر مسلم لیگ کے موقف کی حمایت کی اور کانگرس کی ہٹ دھرمی کی مذمّت کی اور پُر امن تقسیم کو یقینی بنانے کے لیے مصالحت پر زور دیا، مگر اِن کی کسی نے نہیں سنی۔ محض آٹھ نو سالوں سے متحرک ادیبوں کی ایک تنظیم کا ایک نیم خواندہ معاشرے میں بہت زیادہ مؤثر کردار ممکن ہی نہیں تھا۔ غلامی کے ایک طویل دور کے بعد ملنے والی صبحِ آزادی جب شب گزیدہ سحر اور داغ داغ اجالا محسوس ہو رہی تھی، تو فسادات جاگیردار اور

سرمایہ دار طبقے کے لیے تو ایک رحمت ثابت ہوئے ،مگر نچلے طبقوں اور ترقی پسند قوتوں کو اِس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ترقی پسند تحریک کا آزادی کا خواب تو پورا ہوگیا، مگر انقلاب کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ ترقی پسند قیادت کی بعض غلطیاں بھی تھیں۔پاکستان میں تحریک نے اختلاف کرنے والوں کے بارے جو سخت مؤقف اپنایا،وہ غیرضروری اور انتہا پسندانہ معلوم ہوتا ہے۔منٹو ایسے انسان دوست فن کار پر غیر ترقی پسندی کا لیبل لگانا ایک ایسی حماقت تھی،جس کا منٹو کو تو کیا فرق پڑنا تھا،مگر ایسی حرکتوں سے تحریک ضرور کم زور ہوئی۔ ممتاز اُردو شاعر اختر الایمان کو نظرانداز کرنا بھی ترقی پسند ناقدین کی غلطی خیال کیا جائے گا۔ پاکستان میں ریاستی سطح پر ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا،وہ بہت ہی تکلیف دہ ہے، جس سے پاکستانی سماج میں روشن خیال فکر کے فروغ میں شدید قسم کے مسائل پیدا ہوئے ،بل کہ بلواسطہ طور پر انتہاپسندی،مذہبی جنونیت اور جاگیرداری سوچ پروان چڑھی۔

ترقی پسند قیادت سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ترقی پسند فکر کے فروغ کے لیے یہاں کی آبادی کے دو تہائی حصے یعنی کھیت مزدور اور کسان کو نئے شعور اور نئے نظریات سے مربوط انداز میں آگاہ نہیں کیا ۔ ایک ادبی تنظیم کا ایک ناخواندہ طبقے میں نفوذ بہت زیادہ مشکل سہی ،مگر ناممکن نہیں ہوتا۔جو لوگ صدیوں سے جاگیرداروں کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، شہری آبادی کی نسبت زیادہ مشکلات سے دوچار تھے۔ اُنھیں بیدار کرنے،ممکن حد تک اُن کی زندگی کا رنگ بدلنے کے لیے لکھاری اُس طرف زیادہ بہ تر طریقے سے متوجہ ہوسکتے تھے۔برّعظیم میں دیہی زندگی کی ادب میں عکاسی کے حوالے سے مختلف اصنافِ ادب میں ترقی پسند ادیبوں نے جونمونے فراہم کیے ہیں۔وہ اُردو ادب میں معنی خیز،مؤثّر اور دیرپا اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔کہانی کاری میں پریم چند، بیدی ، احمد ندیم قاسمی،شوکت صدیقی اورعبداللہ حسین وغیرہ نے ناولوں اور افسانوں میں جس فن کارانہ مہارت اور دانش افروز اُسلوب میں دیہی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر کیے ہیں،ترقی پسندتحریک سے پہلے اُردو میں اُس کا تصوّر بھی محال تھا۔شاعری میں فیض،علی سردار جعفری،احمد ندیم قاسمی،ظہیر کاشمیری ،ساحر،کیفی اعظمی،مجاز اور مجروح سلطان پوری ایسے شعرا کی تیس کی دہائی میں شروع ہونے والی کاوشیں آج اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ قارئین اور نئے شعرا کے لیے قابلِ توجہ اور معنی خیز حوالے کے طور پر موجود ہیں،جن سے اُردو شاعری کا دامن وسیع ہوا۔

بعض حلقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب حکومتیں یہاں صنعتی انقلاب کے سبز باغ دکھا رہی تھیں۔اُس وقت ترقی پسند ادیبوں کو ہوش مند شہری ہونے کے ناطے اپنے دائرہء کار میں رہتے ہوئے حکومت اور عوام دونوں کو یہ باور کرانا چاہیے تھا کہ اِس زرعی معاشرے میں زراعت کو نظرانداز کرکے کسی بڑی اقتصادی تبدیلی کے لیے راہ ہموار نہیں کی جاسکتی۔ اصولاً اِس طرح کی فکری راہ نمائی میں کوئی قباحت نہیں ہوتی،مگر اِس بات کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ ادیبوں اور مقتدر منصوبہ سازوں میں بہ ہرحال بہت فرق ہوتا ہے۔ترقی پسندادیبوں کا کام اُس مزاج کی تخلیق اور تعمیر ہوتا ہے ،جو معاشرے میں انسان دوست اور میانہ رو فکر کا ضامن بنتا ہے۔ترقی پسند قیادت سے یہ بھول ضرور ہوئی کہ وہ اِس بات کو فراموش کر بیٹھی کہ چین اور روس کی نسبت یہاں مذہبی عنصر بہت طاقت ور تھا اور جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ اُسے اپنے مفاد میں وقتاً فوقتاً استعمال بھی کرتا تھا۔ اِس پس منظر میں مقامی صوفیا کی انسان دوست فکر اور اُسلوب سے مدد لی جاسکتی تھی۔صوفیا کا سوزِ مشتاقی ایک مؤثر وسیلہ بن سکتا تھا، جس سے یہاں کے ناخواندہ اور پس ماندہ طبقات بھی کسی حد تک واقف تھے، لیکن اُس طرف توجہ نہ دی جاسکی۔ برّعظیم میں ترقی پسند فکر کے فروغ میں ایک بڑی

رکاوٹ لسانی مسئلہ بھی رہا ہے۔جیسے موجودہ پاکستان میں اُردو زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں ترقی پسند فکر سے متعلق خاطر خواہ مواد فراہم نہیں ہوسکا اور اُردو کا دائرہ بڑی حد تک شہروں تک محدود رہا ہے۔ اِن مشکلات اور کمیوں کے باوجود برِّعظیم میں ترقی پسند فکر نے ادب ، سیاست اور ثقافت سمیت زندگی کے کئی اہم شعبوں میں اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔اِس تحریک کی حقیقت پسندی نے یہ احساس دلایا کہ ادب میں اہم کردار وہ ہی ہو گا، جو معاشرے اور زندگی میں اہم کردار ادا کر رہا ہو گا، چاہے وہ کوئی مزدور ہو یا کسان، شودر ہو یا غریب آدمی۔اِس تحریک کے مکمل کام یابی نہ حاصل کرنے کی وجہ محض ترقی پسند قیادت ہی نہیں، بہت سارے غیر ادبی عوامل بھی رہے ہیں۔ ترقی پسند فکر کسی جامد نظام کا نام نہیں۔پُر جوش نظریاتی وابستگی کی کئی وضعیں اور جہتیں ہوسکتی ہیں، صورتِ حالات کے مطابق جن پر نظرِ ثانی کی جا سکتی ہے، جیسا کہ اصغر علی انجینیر زندگی کی بے کرانی کے مقابلے میں نظریات کی تحدید کی طرف اشارہ کیا ہے:

''زندگی اور اس کے مسائل ہر نظریے سے بڑے اور زیادہ پیچیدہ ہیں کوئی بھی نظریہ کتنا ہی ہمہ گیر کیوں نہ ہو، کوئی بھی فکری نظام کتنا ہی مربوط اور منطقی کیوں نہ ہو، زندگی کے تمام حقائق ، پہلوؤں اور پیچیدگیوں کو اپنے ڈھانچے میں نہیں سموسکتا۔زندگی ہر نظریے سے بڑی ہے، لیکن نظریے کی حدود کا تعین اُس کی نفی نہیں ہے۔نظریہ ایک خاص دور کے اہم پہلوؤں کو اُس کے تضادات اور قدری ترجیہات کو فوکس کرتا ہے۔اِس لیے اُس کی اپنی زبردست اہمیت ہے، جس طرح گھنے جنگلوں اونچے پہاڑوں، گہرے سمندروں اور ناہموار میدانوں سے گزرنے کے لیے راستے اور پلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔جس طرح ہموار راستے سے گزرنے کے یہ معنی نہیں کہ آس پاس کی ناہمواریوں ، پہاڑوں اور اوبڑ کھابڑ زمینوں کو نظر انداز کر دیا جائے، اِسی طرح نظریے کو اپنانے کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کی دیگر پیچیدگیوں اور ناہمواریوں کو بھول جائیں۔ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی نظریہ دیتی ہے۔نظریہ زندگی نہیں۔'' [۲۸]

ادب ،ادیب اور معاشرے کی ذمہ داریوں کے کثیر جہتی اور پیچیدہ سوال کو پروفیسر آلِ احمد سُرور نے اپنے ایک انٹرویو میں بڑی خوش اُسلوبی سے بیان کیا ہے:

'' ادب کا معاملہ اِتنا سیدھا سادا نہیں ہے۔ادب کوئی تلوار نہیں ہے، جس کے ذریعے آپ انقلاب لے آئیں۔ادب شخصیت ، ذہنی میلان اور فضا پیدا کرتا ہے اور ادب کے ذریعے جو ذہن پیدا ہوتا ہے اُس میں تبدیلی کی خواہش ہوتی ہے۔ اِسی لیے مَیں دانش وری کو اہمیت دیتا ہوں۔ اچھا دانش ور وہی ہے، جو مسائل پر غور کرنے کے بعد عمل کی راہ سُجھائے، کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ اصل طاقت عوام کے پاس ہوتی ہے اور اِسی لیے جمہوری ادارے وجود میں آئے ہیں۔۔۔ ادیب ذہنوں کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ صالح قدروں کو تازہ کرتا ہے، وہ قدریں جو بالآخر دنیا کو روشن کرتی ہیں۔ انقلاب لانا صرف ادیبوں کا فریضہ نہیں ہے، یہ ایک مشترکہ جدوجہد کے ذریعے ہی آسکتا ہے۔'' [۲۹]

پاکستانی سماج میں ترقی پسند فکر کے فروغ میں حائل مشکلات کی ایک تصویر روش ندیم اور صلاح الدین درویش کی کتاب میں بھی ملتی ہے:

''ضیاء مارشل لاء اور پے در پے جمہوری تماشوں کے بعد صورتِ حال یہ سامنے آئی کہ عقل دشمنی، فرقہ پرستی، رجعت پسندی ،تشدّد پسندی اور نظریہ دشمنی کے ساتھ ساتھ سٹیٹس کو کے رجحانات انتہائی مستحکم ہوگئے۔ نئی نسل ترقی پسندی تو دور کی بات نظریہ کے معانی سے آشنا نہیں رہی ۔رُوس کی شکست وریخت کے نتیجے میں اُبھرنے والے نئے عالمی نظام نے جس غیر نظریاتی عہد کا آغاز کیا، اُس کا سب سے زیادہ فائدہ استحصالی قوتوں کو ہوا۔ اُس میں فروغ پذیر پاکستانی ادب بھی خلا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں رہا۔''[۳۰]

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادب اور زندگی کے معاملات میں انفرادی نقطۂ نظر پر زور دینے والوں نے اجتماعیت پسندی کے نظریات سے اختلاف کیا ہے۔ اِن اختلاف کرنے والوں میں محمد حسن عسکری بہت نمایاں رہے ہیں :

''خود آگاہی مجبور کرتی ہے کہ زندگی کے دوسرے اُصولوں کا وجود تسلیم کیا جائے۔ دوسروں کے اندر بھی ایک بالکل مختلف اور اتنی ہی قابلِ وقعت انفرادیت مانی جائے۔ جس چیز کو ہماری دنیا اجتماعیت پسندی سمجھتی رہی ہے وہ در حقیقت انفرادیت پرستی کی بدترین شکل ہے۔ چند سربرآوردہ لوگ، خواہ ان میں کتنی ہی اعلیٰ صفات کیوں نہ فرض کر لی جائیں، اپنے ذاتی خیالات کو عوام کی مرضی کہہ کہہ کر لوگوں کے حلق میں ٹھونستے رہے ہیں۔ میرے لیے تو اجتماعیت کی وہ شکل قابلِ قبول ہوسکتی ہے جہاں سیاسی جسم کے ہر ہر عضو کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے اور اسے ترقی دینے کی کامل آزادی حاصل ہو۔''[۳۱]

نام ور کہانی کار انتظار حسین ،جو محمد حسن عسکری کے شاگرد اور ترقی پسند تحریک پر سخت تنقید کرنے والوں میں ہیں۔وہ بھی اِس تحریک کی اتنی اہمیت تو تسلیم کرتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک اور سوچ ابھی تک زندہ ہے۔تنظیم کے طور پر یہ ختم ہوگئی ہے،مگر ہماری روایت کا حصہ بن چکی ہے۔ہم نے ضرور اِس کی مخالفت کی تھی،وہ الگ بات،لیکن یہ ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی،جو ادب زندہ رہنے والا تھا،وہی روایت اور تاریخ کا حصّہ بنا۔''[۳۲]

انتظار حسین کے برعکس ناول نگار اور نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی نے انجمن ترقی پسند تحریک کے بارے میں اپنا تأثر جس طریقے بیان کیا ہے ،وہ خاصا قابلِ اعتراض اور پریشان کُن ہے:

''یہ انجمن ادب کے نام پر ایک پھوڑے کی طرح نمایاں ہوئی اور اگر اِسے آپریشن کر کے الگ نہ کردیا جائے،تو پورے جسم کے خون کو پیپ میں تبدیل کر دے گی۔''[۳۳]

یہ ایک ایسی اہم ادبی فکر،تحریک اور تنظیم ،جس کی وجہ سے کتھن ،شاعری اور تنقید میں کئی طرح کے اضافے ہوئے ،اُردو ادب تاریخی شعور،سیاسی شعور اور سماجی شعور کی مختلف جہات سے آشنا ہوا۔عمرانی تنقید کے تصوّرات عام ہوئے، اُس کے بارے میں غیر سنجیدگی سے دی جانے والی اِس رائے سے کوئی خامی سامنے نہیں آتی ،البتّہ لکھنے والے کی جذباتیت،تعصّب اور احساسِ کم تری کی نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سُرور نے جس طرح ترقی پسند تحریک کی اہمیت واضح کی ہے ، اُس ڈاکٹر احسن فاروقی کی کی محولہ بالا رائے کی بے تہی بھی سامنے آتی ہے:

''اِس[تحریک] نے مریض روحانیت،تصوّف اور نام نہاد مذہب کی آمریت کے خلاف،جو آواز اُٹھائی ،وہ صحیح تھی۔اِس نے خوابوں کی دنیا میں ننگی تلوار سے ہل چل بھی ڈال دی،اِس نے نفسیاتی تحقیق سے کام لے کر لاشعور کے سربستہ رازوں کو بھی خوب بے نقاب کیا۔اِس نے معاشرت کے زخموں کو کرید کر علاج کے لیے نئی فضا بھی پیدا کی۔اِس کے فارم میں تجربے بھی خیال انگیز ثابت ہوئے۔اِس نے فن کاروں کے افقِ ذہنی کو وسیع بھی کیا۔اِس نے عوام سے قربت کی خواہش ظاہر کر کے گویا زندگی سے قریب بھی ہونا چاہا۔'' ۳۴

برِّعظیم میں ترقی پسند فکر کے ذریعے آنے والی ادبی تبدیلی کو ڈاکٹر ظ۔انصاری کی بیان کردہ اِس ایک مثال سے ظاہر کیا جا سکتا ہے:

''کوئی کچھ کہے اتنا تو ضرور ہوا ادب میں ترقی پسند تحریک اتنا تو ضرور کر گئی کہ لکھنے والوں کو رجعت پرستی کے لفظ اور مبہم تصور سے گھن آنے لگی ہے،کوئی بھی اپنے آپ کو رجعت پرست کہنے یا ماننے پر آمادہ نہیں۔'' ۳۵

عالمی ادب میں نظریے،وابستگی اور تکنیک کے حوالے سے گزشتہ نصف صدی میں گوناگوں تبدیلیاں رُونما ہو چکی ہیں۔اِس کے باوصف اُردو ادب میں نظرانداز اور فراموش کی گئی کئی انفرادی اور اجتماعی جہات ،جن میں سماجی پیچیدگیوں،نفسیاتی الجھنوں،طبقاتی جکڑبندیوں اور سیاسی شعبدہ بازیوں کو ترقی پسند تناظر میں منضبط موضوعات کی صورت میں پیش کیا گیا،آج بھی اُردو قارئین کے لیے کثیر جہتی معنویت کے حامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد صفدر میر،''فیضؔ کا نظریۂ سخن''،مشمولہ فیض احمد فیضؔ ،مرتبہ خلیق انجم ،فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۱ء،صفحہ نمبر ۱۸۷

۲۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب،کاروانِ ادب،ملتان، ۱۹۸۶ء،صفحہ نمبر ۱۱

۳۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب،مکتبہ ء پاکستان، لاہور،س۔ن۔،صفحہ نمبر ۱۱۱

۴۔ علی سردار جعفری،ترقی پسند ادب ،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر ۱۸۶

۵۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، حوالہ مذکور،صفحہ نمبر ۷۴ تا ۸۱

6- Carlo Coppola,Dr.,Some European Aspects of the progressive Movement in Urdu, Jashnnama Vol.11,The University Oriental College Lahore. Page217

۷۔ ریاض احمد، ریاضتیں،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء،صفحہ نمبر ۲۱۱

۸۔ جوگندر پال،'' ترقی پسند فکر اور افسانہ'' مشمولہ ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر،ترتیب: پروفیسر قمر رئیس۔سید عاشور کاظمی ، انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر لندن، دہلی، ۱۹۸۷ء،صفحہ نمبر ۱۴۱

۹۔ انوار احمد،ڈاکٹر، اُردو افسانہ؛تحقیق وتنقید،بیکن بکس ،ملتان ،۱۹۸۸ء،صفحہ نمبر ۱۳۳

۱۰۔ احمد علی، پروفیسر، ''ترقی پسند تحریک کا پس منظر اور ن م راشد'' ، ادبِ لطیف ،لاہور، سال۲۹،شمارہ۱۴۸،شاعتِ خاص،صفحہ نمبر۴۱

۱۱۔ ایضاً،صفحہ نمبر۴۳

۱۲۔ ڈاکٹر یوسف سرمست،بیسویں صدی میں اُردو ناول،ترقی ءاُردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۹۵،صفحہ نمبر۳۰۱

۱۳۔ سجاد ظہیر، روشنائی ،کراچی،مکتبہ ءدانیال، ۱۹۸۶ء،صفحہ نمبر ۸۸

۱۴۔ اختر حسین رائے پوری ،''ادب اور زندگی'' مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۱۶۱

۱۵۔ پریم چند،''ادب کی غرض وغایت''،مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۱۶۴

۱۶۔ پروفیسر احمد علی، ترقی پسند تحریک کا پس منظر اور ن۔م۔ راشد، حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۴۵

۱۷۔ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں،انجمن ترقی ءاُردو،کراچی،۱۹۸۳ء،صفحہ نمبر۴۹۳ تا۴۹۶

۱۸۔ محمد علی صدیقی ،''ترقی پسند غزل کے نقیب''،مشمولہ مشعلِ جاں از مجروح سلطان پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۱ء، صفحہ نمبر۱۲

۱۹۔ رالف رسل،''ترقی پسند تحریک کی لیڈر شپ'' مشمولہ ترقی پسند ادب ۔پچاس سالہ سفر،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۹۶

۲۰۔ عارف عبدالمتین ،''پاکستان کے شعری رجحانات''، سویرا، لاہور،۷،صفحہ نمبر۹۴۔۹۳

۲۱۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، وضاحتیں،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر ۵

۲۲۔ اصغر علی انجینئر ،''ترقی پسند تحریک کے نظریاتی مسائل'' مشمولہ ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۱۳۳۔۱۳۲

۲۳۔ ایم۔این۔رائے،رائے کے مضامین،مکتبہ ءاُردو،لاہور،س۔ن۔،صفحہ نمبر۴۲

۲۴۔ آفتاب احمد،ڈاکٹر،اِشارات،دانیال، کراچی،۱۹۹۶ء،صفحہ نمبر۱۱۲۔۱۱۱

۲۵۔ مجنوں گورکھ پوری،''نئی اور پرانی قدریں''،سویرا،لاہور،۱۶۔ ۱۵،صفحہ نمبر ۱۷

۲۶۔ عبدالعلیم،ڈاکٹر،''ادب اور مارکسزم'' مشمولہ ترقی پسند ادب ۔پچاس سالہ سفر،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر ۱۹۱

۳۷۔ وارث علوی،منتخب مضامین،فضلی سنز،کراچی،۲۰۰۰،صفحہ نمبر۱۷۳

۲۸۔ اصغر علی انجینئر،''ترقی پسند ادب کی نظریاتی بنیادیں'' مشمولہ ترقی پسند ادب۔ پچاس سالہ سفر،حوالہ مذکور،صفحہ نمبر۹۴۔۹۳

۲۹۔ آلِ احمد سُرور ،مشمولہ ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' (عہدِ حاضر کے ۲۴ اہم ادیبوں انٹرویو) ،مرتب طاہر مسعود،مکتبہ تخلیقِ ادب، کراچی ۱۹۸۵ءطبع ثانی،صفحہ نمبر۱۳۴

۳۰۔ روش ندیم،صلاح الدین درویش،جدید ادبی تحریکوں کا زوال،گندھارا،راول پنڈی،۲۰۰۲ء،صفحہ نمبر۱۴

۳۱۔ محمّد حسن عسکری، جھلکیاں، مرتب: سہیل عمر۔نعمانہ عمر، مکتبہ الروایت ،س۔ن۔صفحہ نمبر۴

۳۲۔ انتظار حسین، مشمولہ اُردو کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۰۰ء تک)، ڈاکٹر سلیم اختر ،، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، صفحہ نمبر ۴۵۰

۳۳۔ احسن فاروقی، ناول کے پچیس سال، ساقی، کراچی، جوبلی نمبر، ۱۹۵۵ء، صفحہ نمبر۴۴

۳۴۔ آلِ احمد سُرور مشمولہ ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اُردو ناول، حوالہ مذکور، صفحہ نمبر ۳۰۶

۳۵۔ ظ۔ انصاری، کتاب شناسی، یونی ورسل پریس، بمبئی، ۱۹۸۱ء، صفحہ نمبر ۷۲